تحصیل: ادارہ معارفِ اسلامی کراچی۔جلد: ۱،شمارہ: ۱ جولائی ۔دسمبر ۲۰۱۷ء

اقبالؔ کے چند فارسی اشعار و قطعات: غیر مطبوعہ شرح از صوفی تبسّم

ارشد محمود ناشادؔ*

صوفی غلام مصطفی تبسم (۱۸۹۹ء تا ۱۹۷۸ء) بیسویں صدی کے اکابر تخلیق کاروں میں شامل ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے نوازا تھا؛ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں اُن کی فعال کارگزاری اُن کی اسی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا کرشمہ ہے۔ بچوں کے ادب میں اُن کی نگارشات کو درجۂ اعتبار و استناد حاصل ہے۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات، کیفیات اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جو ادب تخلیق کیا وہ اپنے رنگ، رس، تاثیر اور ذائقے کے اعتبار سے منفرد اور بے مثال ہے۔ اس کے علاوہ شاعری، نثر، شرح نویسی، غالب شناسی، اقبال شناسی، شعرفہمی، ترجمہ کاری اور تدریس کے شعبوں میں بھی انھوں نے لازوال اور یادگار کارنامے انجام دیے۔ فارسی، پنجابی، اُردو اور بعض دوسری زبانوں پر وہ قدرت رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ادبی اور لسانی سرمائے پر ان کی گہری نظر تھی۔ بسیط مطالعے اور مختلف زبانوں کے شعر و ادب سے گہری شناسائی کے باعث وہ شعرفہمی کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے منظوم و منثور تراجم اور بعض شعرا کے کلام کی تشریحات سے اُن کی شعرفہمی کی اس منفرد اور مثالی صلاحیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

صوفی تبسم، عہد آفریں شاعر اور مفکر حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی شخصیت اور فکر سے بہت متاثر تھے۔ انھیں اقبال کی مجالس میں بیٹھنے اور اُن سے ہم کلام ہونے کے کئی مواقع ملے اور اُن کا کلام سُننے اور پس منظر جاننے کے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکرِ اقبالؔ سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے اور شعرِ اقبال کی غرض و غایت سے بھی وہ بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں فکرِ اقبالؔ کی تفہیم، تعبیر اور تشریح کا فریضہ صحیح خطوط پر انجام دے کر نسلِ نو کو پیغامِ اقبالؔ سے آشنا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ تنقیدی اور تشریحی مضامین کے علاوہ انھوں نے اقبال کے مشکل اور دقیق اُردو اور فارسی اشعار کی شرح نویسی کا کام بھی انجام دیا۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اقبالؔ کے اُردو اور فارسی کلام کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور شارحینِ کلامِ اقبال میں ایسے اصحابِ علم و نظر بھی شامل ہیں جو اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود صوفی تبسّم کی منتخب کلام کی شرحیں افادیت، تاثیر اور ذائقے میں دوسری شروح پر تقدم اور فضیلت رکھتی ہیں۔ صوفی تبسم چوں کہ ایک اعلا

* پروفیسر، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

درجے کے استاد تھے اور مؤثر تدریس کے اجزائے ترکیبی سے انھیں پوری واقفیت تھی، اس لیے ان کی تشریحات میں ایسے اجزا گندھے ہوئے ہیں، جو تفہیم کے نئے در وا کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ صوفی تبسم کی شرح نویسی کا اسلوب نہایت سادہ، رواں دواں اور غیر مبہم ہے۔ صوفی تبسم اشعار کی تشریح کرتے ہوئے تاریخی واقعات، اہلِ علم و دانش کے اقوال اور اساتذہ کے برمحل اشعار پیش کرتے ہیں۔ اس رنگِ تشریح سے اشعار کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور قاری کو شعر کی تہ داری سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نئی نسلوں کو اقبال کی آفاقی فکر اور ان کے پیغام سے متعارف کرانے کے لیے صوفی غلام مصطفی تبسم نے ریڈیو پاکستان سے ''اقبال کا ایک شعر'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو کئی سال جاری رہا۔ اس سلسلے میں اقبال کے مشکل اور دقیق اُردو اور فارسی اشعار اور قطعات پیش کیے گئے۔ ریڈیو پاکستان پر پیش کردہ منتخب اشعار کی تشریحات نے نوجوانوں میں ولولۂ تازہ بیدار کرنے اور انھیں فکرِ اقبال سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس متاعِ بیش بہا کو آئندہ نسلوں کے واسطے محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۷۷ء میں اقبال کے صد سالہ یومِ ولادت کے موقعے پر ''شرح صد شعرِ اقبال: اُردو'' کی اشاعت مرکزی اُردو بورڈ، لاہور کے ذریعے عمل میں آئی۔ اسے جلد اوّل قرار دیا گیا اور اشفاق احمد نے اپنے پیش لفظ ''نذرانۂ عقیدت'' میں لکھا کہ اقبال کے فارسی اشعار کی شرح فارسی اشعار اور قطعات کی شروح کو مرتب ہونے میں بہت وقت لگ گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر وحید قریشی، ناظم اقبال اکادمی، لاہور کی تحریک و تشویق پر صوفی تبسم کے فرزندِ ارجمند صوفی گلزار احمد نے صد شعرِ اقبال: فارسی کے عنوان سے انہتر اشعار اور اکتیس قطعات کی شروح کو یک جا کر کے اقبال اکادمی، لاہور سے شائع کیا۔ اگرچہ کتاب پر مرتب کی حیثیت سے صوفی گلزار احمد کا نام درج ہے تاہم مرتب کی ذمہ داری کو انھوں نے پورا نہیں کیا۔ انھوں نے محض ایک صفحے کا ابتدائیہ ''عرضِ مرتب'' کے عنوان سے تحریر کیا جس میں وحید قریشی صاحب کی تحریک پر اس کام سے عہدہ برا ہونے کا ذکر اور مستقبل میں صوفی تبسم کی غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کرنے اور اشاعت آشنا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ''کچھ صد اشعار فارسی کے بارے میں'' کے عنوان سے ڈاکٹر عبید اللہ خان کی تحریر شامل ہے۔ اس تحریر میں انھوں نے صوفی تبسم کی شروح اور اشعار کے انتخاب کے بارے میں اجمالی تبصرہ کیا ہے۔ اشعار کے انتخاب کے بارے میں انھوں نے لکھا:

> ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی تبسم صاحب نے علامہ اقبال کے ان اشعار کو نشر کرنے کے لیے منتخب کیا ہے، جن سے جوان نسل میں ایک ولولۂ تازہ اور جذبۂ نو بیدار ہو۔ یہ نسل ان اشعار کی روشنی میں اپنی کردار سازی کر سکے اور عمل کا پیکر بن کر ایک سچی اور محبِ وطن قوم بن کر ابھرے۔ ان اشعار کے انتخاب سے صوفی صاحب مرحوم کی قومی و ملی لگن اور حب الوطنی کے جذبہ

کا بھی اظہار ہوتا ہے[۱]۔

ڈاکٹر عبید اللہ خان نے اسی تعارفیے میں یہ انکشاف بھی کیا:

> راقم نے بڑی محنت سے ان اشعار کے صحیح نقل ہونے کی طرف توجہ دی ہے۔ نقل ہونے میں بعض اشعار میں غلطیاں رہ گئی تھیں، انھیں درست کیا ہے۔ بعض جملوں میں الفاظ چھوٹ گئے تھے، انھیں پورا کیا ہے۔ نقل کرنے والے صاحب سے بعض اشعار غلط نقل ہو گئے تھے، انھیں صحیح کیا گیا ہے۔ یہ سب کام راقم الحروف نے کلیاتِ فارسی کو سامنے رکھ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر شعر کے بعد بریکٹ میں اس کی نشان دہی کر دی جائے کہ وہ شعر یا قطعہ اقبالؒ کے کس مجموعۂ فارسی سے لیا گیا ہے[۲]۔

گویا مرتب کی ذمہ داریاں ڈاکٹر عبید اللہ خان نے انجام دی ہیں۔ تاہم ترتیب کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ مثال کے طور پر صد شعرِ اقبال: فارسی میں حواشی کا التزام نہیں کیا گیا، جس کی کہیں کہیں ضرورت تھی۔ یہ اشعار اور قطعات جس ترتیب سے نشر ہوئے، اس ترتیب سے انھیں شاملِ کتاب نہیں کیا گیا بلکہ بہ قول ڈاکٹر عبید اللہ خان، صوفی گلزار صاحب نے غالباً موضوع کے اعتبار سے انھیں مرتب کیا ہے۔ اگر انھیں موضوع کے اعتبار سے مرتب کرنا ضروری تھا تب بھی ہر شعر کے بعد جہاں اس کا ماخذ درج ہے، وہاں اس کی تاریخِ نشر درج کی جانی چاہیے تھی۔ اگرچہ ڈاکٹر عبید اللہ خان نے ''بڑی محنت'' سے اشعار نقل کرنے کا ذکر کیا ہے مگر اشعار و قطعات کا متن اس ''بڑی محنت'' کی گواہی نہیں دیتا۔ تمام اشعار و قطعات میں کہیں بھی حرفِ اضافت کا التزام نہیں کیا گیا۔ بغیر اضافت کے شعر پڑھنا طلبہ اور عام قارئین کے لیے کس درجہ مشکل ہے، اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اشعار کا متن بھی درست نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ گہر در سینہ دریا، خزف بر ساحل افتادہ است ص ۲۳

درست: گہر در سینہ دریا، خزف بر ساحل افتاد است

☆ دلے چشمیکہ بینا شد، نگاہش بر دل افتاد است ص ۳۱

درست: ولے چشمیکہ بینا شد، نگاہش بر دل افتاد است

☆ تب و تاب جگر از لالہ ربودن نتواں ص ۴۱

درست: تب و تاب از جگرِ لالہ ربودن نتواں

☆ ملت از افرادمی یابد نظام ص ۶۴

درست: ملت از افراد می یابد نظام

☆ کاردانش رابقاازمدعاست ص ۸۴

درست: کاروانش رابقاازمدعاست

☆ سفالم رائے او جام جم کرد ص ۲۳۳

درست: سفالم رامیِ او جامِ جم کرد

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے تخلیقی اور علمی سرمائے کو پوری طرح یک جا نہیں کیا جا سکا۔ یہی وجہ کہ اُن کی بہت سی تحریریں ہنوز غیر مطبوعہ اور غیر مدون حالت میں موجود ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے ''اقبال کا ایک شعر'' نامی سلسلہ طویل عرصہ تک نشر ہوتا رہا۔ اس لیے سواُردو اور سو فارسی اشعار کی مطبوعہ شروح کے علاوہ بھی کئی ایسے اشعار اور قطعات موجود ہیں، جن کی شرح صوفی تبسم نے اپنے پروگرام میں پیش کی۔ راقم کو پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی [م: ۲۰۰۷ء] کے کاغذات سے محبوب عالم، اسسٹنٹ شعبۂ اُردو کے ذریعے کچھ عکسی نقول (بہ خطِ صوفی تبسم) حاصل ہوئیں۔ ان کاغذات میں اس سلسلے میں پیش کیے گئے چند فارسی اشعار اور قطعات کی نقول بھی شامل ہیں۔ ان میں پانچ اشعار اور چھے قطعات ایسے ہیں جو ''صد شعرِ اقبال: فارسی'' میں شامل نہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے ذریعے یہ شروح پہلی بار منظرِ عام پر جلوہ گر ہو رہی ہیں۔

نو دریافت شرحیں فل اسکیپ سفید کاغذ پر بہ خطِ صوفی تبسم تحریر شدہ ہیں۔ صوفی صاحب کا سوادِ تحریر دل کش اور خوب صورت ہے۔ مختلف مقامات پر کاٹ پیٹ اور تصحیحات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ تحریریں قلم برداشتہ ہیں۔ شرح میں دوسرے شعرا کے برمحل اشعار پیش کیے گئے ہیں، ان پیش کردہ اشعار کے متن میں کہیں کہیں فرق ہے۔ صوفی صاحب کے حافظے میں شعر جس طرح محفوظ تھا، اسی طرح درج ہو گیا ہے۔ راقم الحروف نے ایسے اشعار کا متن درست کر کے حواشی میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ کا املا بھی رسمِ قدیم کا پابند تھا جسے جدید املا میں تبدیل کر دیا ہے۔ اشعار اور قطعات پر تاریخِ نشر تحریر ہے، اس لیے زیرِ نظر مضمون میں بھی ان تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے اور شروح کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اشعار اور قطعات کا متن جدید فارسی املا کے مطابق نہیں کیوں کہ صوفی صاحب کے بعض نتائج قدیم املا سے مستخرج ہیں۔ البتہ یہ اشعار اور قطعات اقبال کے جس مجموعۂ کلام میں شامل ہیں، ان کا ذکر حوالہ جات میں کر دیا ہے۔

اشعار کی شرح:

(۱)

بہ چشمِ ہر چہ ہست و بُود و باشد

دمے از روزگارِ آرزوئے [۳]

[تاریخِ نشر: ۱۵؍ستمبر ۱۹۶۵ء]

اس شعر کے لفظی معنی یہ ہیں:

میری نگاہ میں جو کچھ اس دُنیا میں ہے، جو کچھ اس دُنیا میں تھا اور جو کچھ اس دُنیا میں آئندہ ہوگا وہ سب کچھ میری تمنّاؤں کی زندگی کا ایک لمحہ ہے اور بس۔

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں انشا کے تذکرے کے ذیل میں اُن کی زندگی کی خوش حالیوں اور مابعد کی تلخیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انشا کو قدرت کی طرف سے کچھ قہقہے ودیعت کیے گئے تھے، وہ انھوں نے چند دنوں میں ختم کر دیے۔ یہ بات، مولانا آزاد مرحوم نے ایک لطیفے کے طور پر کہی تھی اور اس کے لیے ایک خوب صورت فقرہ چُست کیا تھا لیکن شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی اس شوخ بیانی میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بیان کر گئے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات اس قسم کے نفسیاتی تجربے کو ایک وارداتی لمحے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لمحہ جس میں انسان کی ساری وارداتی یا جذباتی زندگی سمٹ آتی ہے۔ حافظؔ کا ایک شعر ہے:

بفراغِ دل زمانے، نظرے بہ ماہ روئے
بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہاؤ ہوئے [4]

یعنی محبوب کی صحبت میں فراغت کا ایک لمحہ اُس تمام زندگی پر بھاری ہے جو شاہی ہنگامہ آرائیوں میں بسر ہو۔ اس نوعیت کے ایک تجربے کو ایک اور شاعر یوں بیان کرتا ہے کہ:

یہ زندگی، زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہیں بس
وہ عمرِ رفتہ کی چند گھڑیاں جو اُن کی صحبت میں کٹ گئی ہیں

اقبال بھی اسی نوعیت کے تجربے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے اس شعر میں کہتا ہے کہ اس وارداتی لمحے میں جہاں تمنّا اور آرزو اپنی ساری عمر گزار لیتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل سبھی سموئے ہوتے ہیں۔ غزل کے ایک خوب صورت شعر میں اقبال اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

منزلِ عشق بسے دُور و دراز است ولے
طی شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے [5]

یعنی سفرِ عشق بہت دُور و دراز ہے لیکن کبھی کبھی یہ سو سالہ مسافت ایک آہ کھینچتے طے ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی گریہ زاری سمٹ کر ایک آہ میں سما جاتی ہے اور اس ایک آہ میں عاشقانہ زندگی کے تمام درد و کرب بھر جاتے ہیں۔

آں حضرت کے پاس جب پہلے پہل نزولِ وحی ہوا اور ان سے ''اقرا'' کے لفظ دہرانے کے لیے کہا گیا، انھوں نے اپنے اُمّی ہونے کا اظہار کیا، اس پر جب اصرار ہوا اور انھوں نے اس آیت کو دہرایا تو اس ایک لمحے میں اُن کی زندگی، اُن کی شخصیت یکسر بدل گئی۔ اس ایک لمحے میں اُن کا ماضی، حال اور مستقبل اُن پر بہ یک وقت منکشف ہو گیا۔ تبدیلِ دین کا

لمحہ ایسا ہی لمحہ ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں conversion کہا جاتا ہے جو خود شناسی ہی کا دوسرا نام ہے۔

اب ذرا اس شعر کے فنی محاسن اور شاعرانہ نکتہ آفرینیوں پر توجہ کیجیے، جن کا اطلاق اُس نے وقت کی کل کائنات پر کیا اور بڑے اختصار اور حسن و خوبی سے کیا ہے۔ اقبال کا تصورِ وقت کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں دوش و فردا کوئی شے نہیں۔ وقت ''ابدی حال'' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے انسان! گزرا ہوا کل اور آنے والا کل کوئی شے نہیں۔

فقط امروز ہے تیرا زمانہ

اس لیے جب وہ ہست و بود و باشد کے لفظ کہتا ہے تو وہ ہست کے لفظ پر زور دیتا ہے اور اُسے روزگارِ آرزو کے ایک لمحے سے منسوب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آرزوؤں اور تمنّاؤں کے زمانے میں موجودہ لمحہ ہی اصل شے ہے جس میں انسان کی ساری زندگی سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

اقبال نے روزگارِ آرزو کا ایک ایسا پُر معنی اور بلیغ لفظ استعمال کیا ہے کہ اسے چھیڑتے ہوئے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ایک آرزو کیا ہے گویا زندگی کا ایک پورا زمانہ ہے اور اس زمانۂ آرزو کا ایک لمحہ ایک ایسا بھرپور لمحہ ہے کہ جس میں ماضی، حال اور مستقبل سبھی سمائے ہوتے ہیں۔

(۲)

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکی است
بوریا و مسندِ دیبا یکی است۶

[تاریخِ نشر: ۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء]

قرآن کی نظر میں بندہ و آقا دونوں برابر ہیں۔ ایک مردِ فقیر کا بوریا اور شاہنشاہ کی مسندِ کم خواب میں کوئی فرق نہیں۔

اقبال کا یہ شعر اس کی مثنوی رموزِ بے خودی سے ماخوذ ہے اور اس کا پس منظر ایک داستان ہے۔ داستان یہ ہے کہ ایک فرماں روائے باوقار سُلطان مراد اپنے ایک انجینیئر کو ایک مسجد کے تعمیر کرنے پر مامور کرتا ہے۔ مسجد تیار ہوئی تو سُلطان مراد اسے دیکھ کر ناپسند کرتا ہے اور غیظ و غضب میں آ کر اس ماہرِ تعمیر فن کار کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر کرتا ہے۔ وہ مظلوم اپنی فریاد، قاضیِ شہر کے پاس لے جاتا ہے اور کہتا ہے میں تیری عدالت میں حاضر ہوا ہوں، تُو شریعتِ اسلامی کا نگہدار ہے۔ میں شاہنشاہوں کا غلام نہیں ہوں، دینِ اسلام کا پرستار ہوں، مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ انصاف چاہتا ہوں۔

قاضی نے اُس کی فریاد سُنی اور بادشاہ کو اپنی بارگاہِ انصاف میں طلب کیا۔ بادشاہ حاضر ہوا، وہ خطا کاروں کی صف میں کھڑا تھا۔ قرآن پاک کو دیکھ کر اُس کا رنگ فق ہو گیا، شرم سے اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ایک طرف مدعی تھا دوسری طرف شہنشاہِ عالی وقار اور درمیان میں فُرقان۔

قاضی نے بہ آوازِ بلند قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھ کر سنائی وَلکُم فی القصاص حیٰوۃ یا اُولی الالباب (۷) اور کہا یہ قانونِ الٰہی ہے اور اس قانون سے زندگی کو ثبات حاصل ہے۔ ایک عبدِ مسلم احرار سے کم نہیں۔ بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ رنگین نہیں ہوتا۔

جب سُلطان مراد نے یہ بات سُنی تو بلاحیل و حجت اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ معمار نے جب یہ دیکھا تو اُس پر رقت طاری ہوگئی وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے بے ساختہ یہ آیت پڑھی: ان اللہ یا مُرُکم بالعدلِ وَالاحسان ۸ اور کہا میں نے اِسے خدا اور رسول کے صدقے معاف کر دیا۔

یہ قرآنِ پاک کی تعلیم اور آئینِ پیغمبر کی سطوت و عظمت تھی کہ ایک چیونٹی نے سلیمان پر فتح پائی۔ یہ ایک معمار کم عیار کی فتح نہیں تھی یہ دینِ اسلام کی فتح تھی۔ جس کی نظر میں بندہ و آقا ایک ہوتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب ایک مردِ مسلماں، شریعت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے تو یہی وہ وقت ہے جب ایک فرد ملّت کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فرد کی خودی، بے خودی میں کھو جاتی ہے۔ جس طرح ایک فرد ملّت کا احترام کرتا ہے اور اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اِسی طرح ملّت فرد کا احترام کرتی ہے اور اُس کے جذبات و احساسات کو اپنے احساسات کا جز بنا لیتی ہے۔ فرد و ملّت کا یہ ربطِ باہمی دونوں کی زندگی کے تحفظ اور استحکام کا باعث ہوتا ہے اور اِسی سے یگانگت، وحدت و ثبات کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسلام کا یہ عظیم کارنامہ، دُنیا کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ اسلام نے اونچ نیچ کے امتیاز کو مٹا کر تمام بنی نوعِ انساں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور فرد کو ملّت اور ملّت کو فرد سے وابستہ کر کے زندگی کے ایک اساسی اصول کی بنیاد رکھی۔

(۳)

من از غمہا نمی ترسم ولیکن
مدہ آں غم کہ شایانِ دلے نیست ۹

[تاریخِ نشر: ۱۶ نومبر ۱۹۶۵ء]

اقبالؔ کہتا ہے کہ اے خدا! میں غموں سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے وہ غم نہ دینا جو کسی دل کے شایاں نہ ہو۔

اقبالؔ نے اس شعر میں ایک مردِ غیور، ایک بلند ہمت انسان کا تصور پیش کیا ہے اور بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبالؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر بھی تھا دوسرے لفظوں میں وہ مفکر شاعر تھا۔ اردو اور بالخصوص فارسی شاعری پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اور حکمت کے دقیق اور خشک مسائل کو شعر بنا دیا۔ اس شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ نے ایک بڑے اہم نکتے کو بڑی سادگی لیکن اتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ شعر غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے اور وہ چیز جسے ہم تغزّل کہتے ہیں اس میں پیدا ہوگئی ہے اور اقبالؔ کی غزلوں میں تفکر کی گہرائی کے ساتھ تغزّل کی آمیزش ہر جگہ موجود ہے اور باوجود اس کے وہ اپنے آپ کو غزل سے اس طرح بیگانہ کہ کر پکارتا ہے کہ:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ غزل سے آشنا میں ۱۰

اس کے کلام میں غزل کے تمام محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اس کا غزلیہ اسلوب اس کے ہر شعر میں جذبات کی شدت پیدا کرتا ہے اور اسے بے حد مؤثر بنا دیتا ہے۔

آج کے شعر میں وہ غم کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تمکنت کے ساتھ خدا سے یہ کہتا ہے کہ میں دکھوں اور غموں سے ڈرنے والا انسان نہیں غم بڑی جانکاہ شے سہی میں اسے سینے سے لگانے کو تیار ہوں لیکن اتنی بات ہے کہ جو غم بھی میرے دل کو عطا ہو وہ میرے دل کے ظرف اور حوصلے کے مطابق اور شایانِ شان ہونا چاہیے۔ اقبالؔ کو فی الحقیقت اپنی بلند حوصلگی دکھانا مقصود ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میرا دل کسی ادنیٰ غم کا طلب گار نہیں۔ غم کے مدارج ہوتے ہیں۔ غمِ روزگار سے غمِ محبوب تک کتنا فاصلہ ہے!۔ حیوان اور چرند پرند یہ سب روزی کے غم میں نڈھال ہوتے ہیں اور ایسے بھی انسان ہیں جن کے دل چھوٹے چھوٹے غموں سے دکھیا نظر آتے ہیں لیکن بلند نظر اور بلند ہمت انسان ان غموں اور دکھوں کو غم اور دکھ کا نام ہی دیتا۔ اُس کے سامنے غم کسی بڑی چیز کا غم ہوتا ہے۔ وہ اُس بڑی چیز کو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور اسی محبوب کی محبت اور تمنا اور آرزو کو اپنے دل کے خزینے میں جگہ دیتا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی کا شعر ہے:

غمِ جہاں سے ہیں فارغ ستم نشانِ فراق
ترے ستائے ہوؤں کو فلک ستا نہ سکا

محبوب کا غم ایسا غم ہے کہ اس کے سامنے دنیا بھر کے دکھ حقیر نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کہتا ہے۔:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

غالبؔ زندگی کو ایک سراپا درد سمجھتا ہے اور عشق کو اس درد کا مداوا سمجھتا ہے۔ دردِ عشق سے زندگی سنورتی ہے اور زندگی کے سارے چھوٹے چھوٹے دکھ درد، دردِ عشق سے دب جاتے ہیں۔ عشق کا اپنا درد، دردِ لا دوا ہی سہی لیکن دنیا کے سب دکھوں کا علاج تو ہے۔ مولانا رومؔ کا ارشاد ہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

پیر رومی عشقِ الٰہی کو عشقِ خوش سودا کہتے ہیں یعنی وہ عشق جو ایک خوبصورت اور اچھا درد ہے اور وہ درد اس لیے حسین و جمیل درد ہے کہ زندگی کے تمام دکھوں کا مداوا ہے!۔ یقیناً ایسا ہی دکھ، بلند ہمت اور عظیم شخصیتوں کا حصّہ ہوتا ہے اور ان کے سوا دوسروں کو نصیب نہیں ہوتا۔

فارسی میں ''ے'' کا حرف تنکیر کے لیے آتا ہے یعنی ایک مخصوص شے کو عام بنا دیتا ہے۔ دل سے دِلے بن گیا تو اس

سے مراد یہ ہوئی کہ کوئی سا دل۔لیکن اقبال کے اس شعر میں دِلے کی ''ے'' تنکیری نہیں بلکہ تعظیمی ہے۔یعنی اس سے مقصود کوئی سا دل یا عام دل نہیں بلکہ عظیم دل ہے۔ایک ایسا دل مراد ہے جو علّوِ ہمت سے سرشار ہے اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے کسی گوشے میں کوئی حقیر سا غم سما جائے۔اقبال نے اس خیال کو کتنے پیارے انداز میں کہا ہے کہ: ایسا غم نہ دینا کہ جو ایک بلند ہمت دل کے شایاں نہ ہو۔

(۴)

بہر بادے کہ آید سینہ بکشا
نگہدار آں کہن داغے کہ داری[۱۱]

[تاریخِ نشر: ۱۸؍نومبر ۱۹۶۵ء]

اقبال کا یہ شعر ایک فارسی قطعے سے ماخوذ ہے،جس میں وہ لالے کے پھول کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو ہوا بھی چلے تو اُسے آغوش میں لینے کے لیے سینہ کھول دے مگر یہ یاد رکھ کہ جو داغِ کہن تیرے سینے میں ہے،اُسے آنچ نہ آنے پائے۔وہ داغ محفوظ رہے۔

اقبال جدّت پسند بھی ہے اور علم وفن کے بدلتے ہوئے پہلوؤں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ وہ قوم جو زندگی کے میدان میں ترقی کرنا چاہتی ہے اُسے زمانے کی بدلتی ہوئی روش کا ساتھ دینا ضروری ہے۔اگر کوئی قوم اُس کا ساتھ نہ دے گی تو وہ اِس کارزارِ حیات میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکے گی۔ایسی قوم کی حالت اُس مسافر کی طرح ہے جو قافلے سے الگ ہو کر پیچھے رہ جائے۔زندگی کی اس تگ ودو میں ایک لحظہ کی غفلت سے سو سالہ منزل کا فاصلہ پڑ جاتا ہے۔کسی نے کیا خوب کہا ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ را ہم دُور شد

یعنی میں نے چاہا کہ پاؤں میں چُبھا ہوا کانٹا نکال لوں اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ محمل سو سال کی مسافت طے کر کے آگے نکل گیا ہے۔

بہر حال ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے اور اُسی رفتار سے چلے جس رفتار سے زمانہ چل رہا ہے۔اقبال زمانے کی زبان سے یہ الفاظ کہلواتا ہے کہ:

نہ تھا اگر تُو شریکِ محفل قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مِرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر میِ شبانہ

بہر حال زندگی کے اس سفر میں زمانے کی اس تیز رفتاری کے ساتھ چلنا بے حد لازمی ہے لیکن اقبال جہاں ہر نئے

انقلاب اور ہر نئے اجتہاد کا خیر مقدم کرتا ہے وہاں وہ اس بات کا بھی سختی سے حامی ہے کہ ایک ترقی پذیر قوم کے لیے اپنے ماضی کی روایات سے وابستہ رہنا بھی لابدی ہے کیوں کہ اِس کے بغیر کوئی قوم ترقی کی راہ میں کوئی صحیح قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ جو قوم اپنے آپ کو اپنے اَسلاف کی روایات سے الگ کر لیتی ہے وہ زندگی کی راہ میں ڈانواں ڈول گھومتی ہے اور آئندہ سفر کی راہیں مخدوش ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات گمراہی کا باعث بنتی ہیں۔ کسی قوم کی ترقی اور پیش رفت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے اصلی مرکز کو بھول جائے۔ کوئی شاخ، خواہ کیسی ہی آزاد فضا میں سانس لے کر پھل پھول رہی ہو، یہ نہیں کر سکتی کہ وہ درخت سے جدا ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ شاخ کے پھول اور کونپلیں فضا اور ہوا سے بہت کچھ کسبِ حیات کرتی ہیں لیکن اگر وہ درخت سے الگ ہو جائے تو اُس کے نشوونما کے تمام وسائل بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی حال قوم اور اُس کی تاریخ اور قدیم روایات کا ہے جو قوم کی زندگی میں درخت کے تنے اور جڑوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبالؔ کا پورا قطعہ یوں ہے:

مجو اے لالہ از کس غم گساری
چو من خواہ از درونِ خویش یاری
بہر بادے کہ آید سینہ بکشا
نگہدار آں کہن داغے کہ داری

لالے کے پھول کے سینے میں ایک داغ ہوتا ہے۔ پھول کی کلی ہوا کے چلنے سے کھلتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ فضا میں جو ہوا بھی چلے تو اُسے سینے سے لگا لے، دوسرے لفظوں میں تو اسے قبول کر لے اور کھل جا لیکن یہ یاد رہے کہ کسی دوسرے کی کلیتہً دست نگری درست نہیں۔ زندگی کی تعمیر کے لیے خود نگری اور خودنگہداری لازم ہے۔ لالے کے پھول سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ کھلی فضا میں اور ہوا میں جتنا چاہے لہلہا لے لیکن یہ یاد رکھ کہ جو پُرانا داغ تیرے سینے میں ہے کہیں وہ ماند نہ پڑ جائے۔ اُسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کیوں کہ اُسی میں تیری زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور اُسی سے تیری زندگی کی عزت اور عظمت قائم ہے۔ اگر وہ داغِ کہن مٹ گیا تو تُو لالہ نہیں رہے گا۔

(۵)

بگیر اے سارباں راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن ۱۲

[تاریخِ نشر: ۲۳ر نومبر ۱۹۶۵ء]

کسی شاعر نے کہا ہے:

منزلِ شوق چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

کہ جب منزلِ شوق قریب آتی ہے تو میرے شوق کی آگ کم ہونے کی بجائے اور بھی تیز ہو جاتی ہے لیکن اقبال اپنے شعر میں اس کے برعکس بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''اے ساربان منزل کی طرف جانے کے لیے کوئی راہِ دور و دراز اختیار کرتا کہ محبوب سے جدائی کی آگ، جس کے وصال کا شوق مجھے کشاں کشاں لیے جارہا ہے، زیادہ تیز ہو جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے اپنے نظریۂ حیات کو عشق و محبت کے جذبات میں سمویا ہے۔ وہ ایک عاشق کے والہانہ اندازِ مستی کو یوں بیان کرتا ہے کہ محبت کی بے تابیاں اور جدائی کی تڑپ میں جو مزہ ہے وہ وصال کی لذتوں میں نہیں۔ بلکہ عشق و محبت کی کسک ہی ایک شے ہے اور وہ کسک فراق و وصال سے بے نیاز ہے۔ سفرِ عشق کی راہیں کبھی ختم نہیں ہوتیں وہ ایک اور جگہ کہتا ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

زندگی ایک سفر اور سفرِ دراز ہے اور اسی درازیِ سفر کی لذتیں پنہاں ہیں اور یہی لذتیں سرمایۂ حیات ہیں۔ سفر کی صعوبتیں ختم ہو جائیں تو راہ رو کا سفر بے کیف ہو کر رہ جائے۔ سفر کی درازی خستگیوں اور سختیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن عالی حوصلہ اور بلند ہمت انسان ان مشکلات سے نہیں ڈرتے وہ تو بقول مرزا غالبؔ:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

پاؤں کے آبلوں سے گھبرانے کا باعث یہ ہے کہ اس میں راہ رو کے بے دل ہو کر بیٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔ راہ میں خارزار آجائے تو ان کو عبور کرنے سے سفر کی دشواری بڑھے گی اور سفرِ شوق تیز سے تیز تر ہو جائے گا۔ منزل پر پہنچنے کی کئی راہیں ہو سکتی ہیں۔ میرِ کارواں یا ساربان ہمیشہ وہ راہ اختیار کرتا ہے جو قریب تر ہو، اس لیے اقبال پہلے ہی ساربان کو خطاب کر کے کہتا ہے، اسے اپنے رازِ دل سے آگاہ کر رہا ہے کہ دیکھنا اس راہ پہ چلنا جو دور و دراز ہو۔ یہ دُور و دراز کا سفر ہی میرے لیے موزوں ہے کیوں کہ اس میں میرے شوق کی آگ بھڑکتی چلی جائے گی۔

اقبال کا شعر بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بڑی فنی پُرکاریاں ہیں۔ پہلے ساربان سے خطاب، گویا حسنِ خطاب ہے۔ کیوں کہ سفر کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ لازمی طور پر وہی راہ اختیار کرے گا جو اسے جلد از جلد فارغ کر دے لیکن مسافر کی نوعیتِ سفر اور مقصدِ سفر کچھ اور ہے، اس کے نزدیک منزل سے زیادہ سفر عزیز ہے۔ اس کی نظر منزل پر نہیں، سفر کی لذتوں پر پڑ رہی ہے، وہ وصال کی آسودگی کا خواہاں نہیں جدائی کی تڑپ کا خواہاں ہے۔

اقبالؔ نے راہِ دراز کے الفاظ میں دراز کے ساتھ ''ے'' کا حرف ڈال کر اس کے معنی میں گہرائی پیدا کی ہے۔ یہ ''ے'' یائے تنکیری ہے۔ بہ ظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سی دراز راہ لیکن اس ''ے'' میں راہ کی عظمت پوشیدہ ہے کیوں کہ راہِ دراز ایک عظیم راہ ہے۔ ایک ایسی راہ جو مسافر کے شایانِ شان ہے۔ پھر لفظ درازے میں ''ے'' کی موسیقیت کو دیکھیے کہ اس کے تلفظ میں ''ے'' کی صوتی درازی سفر کی طوالت کا احساس پیدا کر رہی ہے۔ دوسرے مصرعے میں اقبالؔ نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے جذبات کو چند لفظوں میں یوں بھر دیا ہے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔

°قطعات:

(۱)

ترا یک نکتۂ سر بستہ گویم
اگر درسِ حیات از من بگیری
بہ میری گر بہ تن جانے نہ داری
وگر جانے بہ تن داری نہ میری ۱۳

[تاریخِ نشر: ۷ رمئی ۱۹۲۶ء]

نکتۂ سر بستہ ایسے پوشیدہ راز کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی لطیف بات پنہاں ہو اور جس کے آشکار ہونے پر کوئی حسین حقیقت ہمارے سامنے آ جائے۔ اقبالؔ اس قطعے میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے: اگر تو زندگی کا سبق مجھ سے لینا چاہے تو میں تجھے ایک لطیف بات بتاتا ہوں جس پر تیری نظر نہیں پڑتی۔ اگر تیرے جسم میں جان نہ ہو تو مر جائے گا اور اگر جسم میں جان ہے تو نہیں مرے گا۔

بہ ظاہر اقبالؔ کا یہ نکتہ بڑا عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے سننے والے کا مذاق اُڑایا ہے۔ جسم میں جان کا ہونا 'زندگی' کی علامت ہے اور جان کا نہ ہونا 'موت' ہے، یہ بات کون نہیں جانتا؟ لیکن زندگی فقط رہنے کا نام نہیں زندگی سانس کے آنے جانے کو نہیں کہتے، بقول مرزا غالب:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے (۱۴)

رگوں میں خون کی گردش تو ہر حیوان اور جانور میں پائی جاتی ہے۔ یہ حرارت تو کیڑے مکوڑے اور نباتات بھی رکھتے ہیں۔ لیکن خون کا آنسو بن کر آنکھ سے ٹپکنا اور بات ہے۔ آنسو درد و سوز، جذب و شوق کی علامت ہے اور یہی زندگی ہے۔

شاعر جب آشکار حقیقت کو کہ جسم میں رجان ہوتو وہ زندہ ہے اور نہ ہوتو مردہ ہے، بیان کرتا ہے تو واقعی ایک نکتہ بیان کر رہا ہے۔ وہ نکتہ جو عام انسانوں کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ اقبالؔ، گوئٹے کا اس لیے معترف تھا کہ گوئٹے قوت اور لذّت کا آرزومند تھا۔ اس نے اپنی کتاب فاؤسٹ میں زندگی کے اسی پہلو کو بڑی شدّت اور تیزی سے نمایاں کیا ہے۔ گوئٹے کے نزدیک ابلیس ایک ایسا کردار ہے جو انسانی زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ وہ ایک تخریبی قوت ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ہر قدم زندگی میں کوئی رخنہ پیدا کرے۔ اس تصورِ ابلیس میں ہمیں رسولِ اکرمؐ کے اس ارشاد کی جھلک نظر آتی ہے کہ:

''شیطان انسان کے رگ و پے میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔''

بہر حال شیطان کے اس تخریبی عمل کے مقابلے میں عشق زندگی کا علم بردار ہے۔ عشق زندگی کا فرشتہ ہے اور اس کا کام شیطان یعنی تخریب کے فرشتے پر غالب آنا ہے۔ اقبالؔ بھی اسی نظریے کو پیش کرتا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک اگرچہ کائنات کی ہر شے فنا پذیر نظر آتی ہے لیکن اس فنا کو شکست دینے والی قوت عشق ہے۔ عشق ایک ایسی قوت ہے جو زندگی کی بقا اور محض بقا نہیں بلکہ اس کے ارتقا کے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ عشق کی قوت برگ و ثمر میں بھی ہے اور حیوان و بشر میں بھی۔

گوئٹے نے بھی فاؤسٹ میں اسی قوت کی وضاحت کی ہے اور ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ''عشق میری تمام تخریبی قوتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ عشق کی یہ خلاق قوت پانی میں، ذہن میں، خشکی میں تری میں، گرمی میں، سردی میں ہر جگہ اور ہر حالت میں موجود ہے اور پھوٹ پھوٹ کر نکلتی اور ظاہر ہوتی ہے۔ اس طوفانِ حیات میں، میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچا کے رکھا ہوا ہے۔''

غرض اقبالؔ اس قطعے میں جب زندگی کے تصور کو پیش کرتا ہوا [کرتے ہوئے] یوں کہتا ہے کہ جسم میں جان ہوتو انسان زندہ ہے تو اس کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ انسان میں عشق کی تونمندی اور قوت کا ہونا ضروری ہے۔ عشق کا دائرۂ عمل جنسی خواہش سے لے کر بنی نوعِ انسان اور محبتِ الٰہی تک پھیلا ہوا ہے۔ انسانی تہذیب اور تمدّن کے تمام پہلو اسی سے اُبھرتے ہیں اور انسانی زندگی کے ارتقا کا سامان بھی یہیں سے مہیا ہوتا ہے۔

''برٹرینڈ رسل'' بھی اس بات کا حامی ہے کہ زندگی میں دو سب سے بڑی اقدار ہیں، ایک علم اور دوسری عشق۔ انھی دو قدروں سے زندگی میں لطف اور لذّت اور ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے؛ اسی سے زندگی میں لطافتیں اور رنزاکتیں آتی ہیں۔ اسی سے زندگی کو ثبات بھی ملتا ہے۔ یہی عشق انسانی زندگی کی جان کی طرح ہے اور اسی جان سے انسان زندہ اور سلامت ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان مر جائے۔

(۲)

برون از ورطۂ بُود و عدم شو
فزوں تر زیں جہانِ کیف و کم شو
خودی تعمیر کُن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم، معمارِ حرم شو۱۵

[تاریخِ نشر:۱۱رمئی ۱۹۶۶ء]

بود و عدم، کے الفاظ بقا و فنا یا ہست و نیست کے لیے آئے ہیں۔ کیف و کم عربی میں استفہام کے حروف ہیں اور اُن کے معنی کیسا اور کتنا کے ہیں۔ اقبالؔ نے اس قطعے کے پہلے مصرعے میں، اس عالم مادی کو بود و عدم کی دنیا کہا ہے اور اسے ورطۂ بود و عدم یعنی موت و حیات کا بھنور کہہ کر پکارا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی عالم مادی کے لیے جہانِ کیف و کم کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس عالم کے ایک دوسرے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ اقبالؔ کہتا ہے کہ:

اے انسان اس ہست و نیست کے بھنور سے باہر نکل آ۔ اس ''کیسے اور کتنے'' کی دنیا سے آگے بڑھ جا۔ اپنے اندر خودی کو تعمیر کر اور ابراہیم کی طرح معمارِ حرم بن جا۔

انسان کی زندگی، اس دنیا میں، موت و حیات کے مخمصے میں الجھی رہتی ہے۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی اسے موت کا خوف طاری رہتا ہے اور یہ خوف اس کی زندگی کی توانائی اور خوشی چھین لیتا ہے اور اس کے دل کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ایک شاعر نے اس شعر میں بیان کی ہے:

ہے موت ساتھ ساتھ برابر لگی ہوئی
تہمت ہے زندگی کی مرے سر لگی ہوئی

اقبالؔ کے نزدیک ایسے انسان یقیناً بُود و عدم کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کے دھندے چھوٹے چھوٹے فائدوں اور نقصانوں کے اندیشوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی نظریں دنیا کے مال و زر کی پیمائشوں سے آگے نہیں جاتیں۔ وہ زندگی کی آسائشوں اور راحتوں اور اس کے دکھوں اور رنجوں کو دولت کی ہی کمی اور بیشی سے ناپتے ہیں۔ اقبالؔ انسان کو زندگی کے اس تنگ دائرے سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ

اور پھر اسی پر اضافہ کرتا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

جس شخص کا تصورِ حیات مکان و زماں کے حدود و قیود سے وسیع تر ہو وہ اس خاکدانِ عالم میں کیسے ذلیل ہو کر پڑا رہ سکتا ہے۔ اقبال انسان کو اس دنیا میں بلند تر ہو کر زندگی گزارنے کا درس دیتا ہے۔ زندگی کی عظیم قدروں کو اپنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی تلقین کرتا ہے۔ المانوی فلسفی کانٹ کا نظریہ یہ ہے کہ: ''جب ہم خالص اساسِ فرض کے ماتحت کسی بلند اخلاقی عمل کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس وقت ہم اس عالمِ مادی سے بلند ہو کر عالمِ حقیقت کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔''

اقبال بھی آج کے قطعے میں جب یہ کہتا ہے کہ اس ہست و نیست کے بھنور سے باہر آ جا اور اس تھوڑے اور بہت کے تنگ دائرے سے وسیع تر ہو جاؤ تو اس کا اشارہ بھی اسی بلند اخلاقی اور روحانی عمل کی طرف ہے۔ اقبال اس بارے میں کانٹ کا ہم نوا ہے اور اس کے نظریے میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے اس قسم کے بلند اخلاقی عمل کے لیے سب سے پہلے انسانی کردار اور شخصیت کی تعمیر کی ضرورت ہوتی ہے، جسے وہ خودی کی تعمیر یا تکمیل کا نام دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک تکمیلِ خودی کے ذریعے، انسان میں عملِ خیر کی صلاحیت کی تربیت ہوتی ہے۔ وہ عبادت کو تکمیلِ خودی کا ایک قوی ذریعہ سمجھتا ہے۔ اقبال نے اس قطعے کے آخری دو مصرعوں یعنی:

خودی تعمیر کن در پیکر خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو

تعمیرِ خودی کیا ہے؟ گویا ایک حرم ہے، ایک کعبہ ہے، خانہ خدا ہے، جسے حضرت ابراہیمؑ کے دنیا نے بتکدے میں تعمیر کیا تھا۔ ''حرم'' توحید کا ایک مادی نشان ہے۔ قومی وحدتِ نظر کی علامت ہے۔ ملت کے عمل کی یکجہتی کا آئینہ دار ہے۔ ایسا حرم جب انسان کے کردار میں پیدا ہو جائے تو وہ انسان، مومن بن جاتا ہے۔

(۳)

جہاں یا رب! چہ خوش ہنگامہ دارد
ہمہ را مستِ یک پیمانہ کردی
نگہ را با نگہ آمیز دادی
دل از دل، جاں ز جاں بیگانہ کردی۱۶

[تاریخ نشر: ۱۶ / مئی ۱۹۶۶ء]

اے خدا یہ دنیا بھی کیا ہنگامہ خیز منظر ہے کہ یہاں کا ہر ذی روح تیرے نشے سے سرشار نظر آتا ہے۔ تو نے نظر سے نظر ملائی کہ دل، دل سے اور جان، جان سے بیگانہ ہو کر رہ گئی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

وہی نورِ ازل ہے جس سے کائنات کا گوشہ گوشہ روشن ہے۔ اسی حسنِ ازلی کے عشق کی سرمستی سے دنیا کا ذرہ ذرہ سرشار ہے۔ غالبؔ نے کس قیامت کا مطلع کہہ دیا:

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا

باہمہ در گفتگو، بے ہمہ در ماجرا[۱۷]

خدا سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ خلا ہو یا ملا تیرے حسن کی ہنگامہ آفرینی بدستور قائم رہتی ہے۔ موجودات ہوں تو تُو اُن سے محوِ گفتگو نظر آتا ہے، نہ ہوں تو تیری جلوہ آفرینیاں قائم ہیں۔

آج کے قطعے کا پس منظر بھی وہی حدیثِ قدسی ہے کہ خدا کا جمالِ ازلی ایک مخفی خزانہ تھا۔ اس میں ذوقِ نمود پیدا ہوا، جس سے کائنات اور اس کے اندر اس حسنِ ازلی کا مشاہدہ کرنے والے معرضِ ظہور میں آئے یہ حسن کی عشق آفرینی اور حسن کی عشق آفرینی ہے جس سے زندگی کے سارے ہنگامے گرم ہیں۔

اسی سے گلشن میں بادِ بہاری چلتی ہے اور وادیوں میں کلیوں کے ستارے چمکنے لگتے ہیں آفتابِ محبت کی شعاعیں سمندر میں اتر کر اس کی تاریک گہرائیوں کو روشن کرتی ہے اور مچھلیوں کو دیدۂ بینا عطا کرتی ہیں۔ اُسی حسنِ ازلی کی محبت کے جام کا قطرہ کائنات کی شے پہ ٹپکا ہوا اور جاندار، حیوان اور انسان اس کے عشق میں سرشار ہے اور ایک دوسرے سے اپنی محبت کی سرمستی میں سبقت لے جانے پر تُلا ہوا ہے۔ نظیریؔ نے کیا خوب کہا:

زبیقرارئ افلاک داغہا دارم

کہ تا زشوقِ تو بر خاستم ننشستند

کہ میں ان سیاروں کی پیہم بے قراری کو دیکھ کر رشک سے داغ داغ ہوگیا ہوں کہ جب سے یہ تیری محبت کی دھن میں اٹھے ہیں، پھر کہیں دم نہیں لیا۔

اقبالؔ نے اس سارے ہنگامے کی ایک بڑی درخشاں تصویر اس قطعے کے آخری دو مصرعوں میں کھینچی ہے۔ الفاظ کیا ہیں چند لکیریں ہیں جن کے دائرے میں وسیع معنی سمائے ہوئے ہیں:

نگہ را با نگہ آمیز دادی

دل از دل، جاں ز جاں بیگانہ کردی

یعنی نگاہ تو نگاہ سے مل گئی لیکن دل، دل سے بیگانہ ہو کر رہ گیا اور جان، جان سے۔ یعنی نگاہیں ملنے پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ دل کو دل کا اور جان کو جان کا ہوش نہ رہا۔

(۴)

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو زخود نا محرمے ہست
قدم در جستجوے آدمی زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست[18]

[تاریخ نشر: ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء]

حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے، کوہ طور پر جلوۂ خدا کے دیکھنے کی بے تابانہ خواہش کی تھی، جسے شاعر نے اس قطعے کے پہلے مصرعے میں یوں بیان کیا ہے کہ:

گدائے جلوہ رفتی برسرِ طور

کہ تو طور پہ جلوے کی گدائی کرتا ہوا پہنچا اور یہ گدائی تُو نے اس لیے کی کہ تو خود اپنے آپ سے نامحرم ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال نے اس واقعہ یا تلمیح کو حضرت موسیٰ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کا اطلاق ہر انسان پر کیا ہے۔ انسان فطرتاً جلوۂ ذاتِ الٰہی کے دیکھنے کے بے تاب ہے اور اس کی یہ بے تابی اس لیے ہے کہ وہ اپنے اصلی مرکز کی طرف جانا چاہتا ہے۔

لیکن انسان خود مظہرِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے احسنِ تقویم سے سنوارا ہے اور اسے اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس میں اپنی صفات ودیعت کی ہیں۔ ان صفات کی تعمیر اور تکمیل کرنا اور اپنی زندگی کو ارتقا دینا، اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ لیکن اس کے لیے انسان کو کسی خارجی نقطے کی طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نقطہ یہ مرکز خود اس کے اندر موجود ہے بلکہ اس کی ذات ہی وہ مرکز ہے۔ جس کے بارے میں اقبالؔ کہتا ہے کہ انسان بے خبر ہے۔ اسی عقیدے نے تصوف میں آ کر ایک بنیادی مسئلے کی صورت اختیار کر لی۔ سعدیؔ فرماتے ہیں:

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

یعنی ساری دنیا تو تیرے حسنِ زیبا کو دیکھ رہی ہے، تو کسے دیکھنے جا رہا ہے۔ مرزا بیدلؔ کا مشہور شعر ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن در آ

کتنے ستم کی بات کہ انسان اپنے وجود میں خود ایک گلستاں ہو اور پھر سیرِ سرو و سمن کے لیے دوسری جگہیں تلاش کرتا پھرے۔ اقبالؔ نے اس قطعے میں تصوف کے اس اندازِ فکر سے ہٹ کر یہ بات کہی ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی کے نشو و ارتقا کا مقصد خدا کی تلاش نہیں، یا دوسرے لفظوں میں خدا بننا نہیں بلکہ انسان بننا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ جلوۂ طور دیکھنے کے لیے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ کسی انسان کی تلاش کر، کیوں کہ یہی تیری زندگی کا عظیم مقصد ہے اور اللہ

تعالیٰ نے تیری تخلیق کرتے وقت بھی اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا تھا۔

اقبالؔ نے ایک جگہ مولانا روم کی ایک غزل کے دو چار قطعہ بند شعر لکھے ہیں، جہاں وہ فرماتے ہیں کہ کل رات میں نے دیکھا کہ شیخ چراغ ہاتھ میں لیے شہر کے گرد گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں اس شہر کی چار دیواری میں رہنے والے حیوانوں، چوپایوں اور درندوں سے سخت اُکتا گیا ہوں، انسان کی تلاش میں نکلا ہوں، جواب ملا کہ ہم تلاش کر چکے ہیں، انسان نہیں ملتا۔ شیخ نے جواب دیا کہ جو چیز نایاب ہے، مجھے اسی کی تلاش ہے۔ اقبالؔ کا ایک اور شعر ہے:

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

قرآن، اللہ پاک کی طرف سے نازل ہوا، محمدؐ پر نازل ہوا، یہ پیغام لانے والا جبرئیلؑ تھا اور یہ سب سلسلے اللہ کی طرف سے ظہور میں آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حرفِ شیریں یعنی قرآن اور قرآن پاک کی تعلیمات کس کی ترجمانی کرتی ہیں؟ خدا کی نہیں۔ انسان کی کرتی ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کرنے سے جو ہستی ظہور میں آتی ہے، وہ خدا نہیں وہ انسان ہے، ایک عظیم انسان، ایک انسانِ کامل۔ اسی لیے اقبالؔ نے اس قطعے کے آخری دو مصرعوں میں:

قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمی ہست

آدمے کا لفظ دو جگہ ''ے'' کے ساتھ لکھا ہے اور یہ ''ے'' یائے تعظیمی ہے۔ یعنی آدم ہی نہیں بلکہ ایک عظیم آدم۔

(۵)

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست
نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بے باک تر نہ در رہِ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست ۱۹

[تاریخِ نشر: ۳؍جون ۱۹۶۶ء]

اس قطعے کا سادہ اُردو ترجمہ یہ ہے:

اس کائنات کا ضمیر تُو ہی ہے، تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ اس بے نشاں ہستی کا نشاں تُو ہی ہے، تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ زندگی کی راہ میں قدم رکھ اور بے باکانہ قدم رکھ۔ کیوں کہ اس جہاں کی وسعتوں میں تیرے سوا اور کوئی نہیں۔

اقبالؔ اپنے نظریۂ خودی کے سلسلے میں جگہ جگہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کا معرضِ وجود میں آنا خود خالقِ کون و مکاں کا احساسِ خودی اور اس کی خودنمائی کے شوق کا نتیجہ ہے۔ گویا انسان میں خودی کا احساس اسے اپنے خالق ہی سے عطا

ہوا ہے اور اسی خودی کی نشوونما میں انسان کے کردار اور اس کی شخصیت کی تعمیر پوشیدہ ہے۔ انسان اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا موجودہ منزل تک آ پہنچتا ہے اور ابھی اس کا سفرِ ارتقا ختم نہیں ہوا۔ وہ سفر بدستور جاری ہے اور اسی طرح جاری رہے گا، اس لیے کہ زندگی کی غایت یہی ہے۔

ایک صاحبِ فکر اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اقبال کا واضح مقصد، فوق البشر کی ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو عقل کے ذریعے عناصر پر لامحدود غلبہ اور اقتدار حاصل کر لے اور ساتھ وجدان کے ذریعے یا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے، خدائی مقاصد سے بھی سرشار ہو۔ وہی انسان اس زمین پر خدا کی خلافت کے مستحق ہوں گے بلکہ یہ زمین و آسماں ان کی میراث ہوں گے۔

قرآن پاک میں انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے اور یہ لقب اس کی تخلیق کی عظمت پر گواہی دیتا ہے اور فقط گواہی ہی نہیں دیتا بلکہ اسے اس کائنات کا مرکز ٹھہراتا ہے اور اسی مرکزیت کی طرف اقبال اپنے قطعے میں اشارہ کرتا ہے اور انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست
نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست

وہ انسان کو کائنات کی تخلیق کا پوشیدہ راز قرار دیتا ہے اور خالقِ کائنات کا نشانِ ظاہری تسلیم کرتا ہے۔ اقبال اپنی ایک طویل نظم ''شمع و شاعر'' میں لکھتا ہے:

اپنی اصلیت کے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
آنکھ دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

اسی نظم میں وہ ایک جگہ کہتا ہے:

آہ! کس کی آرزو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تُو، راہ رو بھی تُو، رہبر بھی تُو، منزل بھی تُو

انسان اپنی خودشناسی سے دور رہتا ہے اور کسی اور منزل کی تلاش کے لیے سرگرداں نظر آتا ہے حالانکہ وہ اس کائنات میں خود ایک منزل ہے۔ اسے کسی اور خارجی منزل کی جستجو کی حاجت نہیں۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

تو کجا بہرِ تماشا می روی

جو ہستی اپنے وجود میں خود ایک جلوہ گاہ ہو اسے کسی اور کے جلوؤں کی کیا ضرورت ہے۔ اقبالؔ یہ نظریہ قائم کرنے کے بعد بڑی بلند آہنگی سے انسان کو بیدار کرتا ہے اور اسے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ اس ساری وسعتِ کائنات میں اسی کی ذات مرکزِ حیات ہے۔ اس بلند آہنگی کی شاعرانہ شوکت و عظمت کو دیکھیے کس خوبصورت انداز میں کہتا ہے:

قدم بے باک تر نہ درِ رہِ زیست

بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

''تر'' کا لفظ فارسی میں صفت کے ساتھ تفضیلِ بعض کی کیفیت ظاہر کرتا ہے لیکن محاورتاً اس کا مفہوم بدل بھی جاتا ہے۔ یہاں بے باک تر میں تر صفت میں کسی مقابلے کے لیے نہیں آیا بلکہ بے باک تر کے معنی ''بہت بے باک'' کے ہیں۔ اقبالؔ اپنے اشعار میں لمبی اور طویل ردیف نہیں لاتا بلکہ اکثر قافیہ اور ردیف کی جگہ، فقط ایک لفظ ''روی'' لاتا ہے جیسا کہ ''بالِ جبریل'' کی نظموں اور غزلوں میں نظر آتا ہے۔ اس قطعے میں ''غیر از تو کس نیست'' ردیف ہے جو اس قطعے کی بحر کے لیے بہت طویل ہے۔ لیکن یہ ارادتاً ایسا کیا گیا ہے اس لیے کہ یہ الفاظ بہت اہم ہیں اور شاعر ان پر بار بار زور دینا چاہتا ہے۔

(۲)

گریز آخر ز عقلِ ذوفنوں کرد

دلِ خود کام را از عشق خوں کرد

ز اقبالِ فلک پیما چہ پُرسی

حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد۲۰

[تاریخ نشر: ۵ر جون ۱۹۲۶ء]

''جنوں کردن'' فارسی کا محاورہ ہے اس کے معنی روزمرّہ کی سادہ سلیس بولی میں جنوں کے آثار پیدا ہونے کے ہیں۔ چنانچہ ''حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا حکیم نکتہ داں، دیوانہ ہوگیا۔ اقبال، مفکر اور فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ انھوں نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مذہب اور دین کی گہرائیوں پر بھی نظر ڈالی تھی۔ بہ قول ان کے وہ فکرِ رازی سے بھی آشنا تھے اور سوزِ رومی سے بھی۔ ان کے دل و دماغ میں یہ دو کیفیتیں جو بظاہر بڑی متضاد نظر آتی ہیں، ہر وقت طاری رہتی ہیں یا یوں کہیے کہ ان کی کشمکش جاری رہتی تھی۔ وہ خود کہتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

یہ ذہنی کیفیت، جس کا ذکر اقبال اس شعر میں کرتا ہے، دراصل کم وبیش ہر شخص کے ذہن کی کیفیت ہے۔ گویا ہر انسان اپنے محدود اندازِ فکر اور جذبات کے اعتبار سے اسی کشمکش سے گزرتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کسی نہ کسی طرح عقل و خرد، اور عشق و محبت کی باہمی کشاکش میں مبتلا رہتی ہے۔ آج کے قطعے میں اقبال نے اسی کشمکش سے مخلصی حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے:

> اقبال نے آخر کار عقلِ فسوں کار سے نجات حاصل کر لی اور اپنے خود پسند، خودغرض دل کو عشق سے خوں کر لیا۔ اب اقبال کی فلک زن خیال آرائیوں اور ذہنی بلند پروازیوں کے بارے میں کیا پوچھتا ہے؟ اب ان باتوں کا تذکرہ نہ کر اب تو یہ حکیم نکتہ داں دیوانگی کی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

اقبال کے افکار سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ وہ عقل و دل یا خرد و عشق کی باہمی نزاع سے آشنا ہے اور جگہ جگہ عقل و خرد کے خلاف عشق و محبت کی فوقیت کو اُجاگر کرتا اور اس کی اہمیت کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے لیکن وہ کسی جگہ عقل و خرد کی قطعی تردید نہیں کرتا بلکہ اس کے مقصد اور مقام کو پہچانتا اور اس کی فطری حیثیت و اہمیت کو جانتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عقلِ انسانی کی فعالیت کا دائرہ محدود ہے اور وہ صرف کائنات کے اجزا کے ادراک تک محدود ہے۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے ظواہر میں جو کثرت نظر آتی ہے وہ درحقیقت ایک وحدت سے ظہور میں آئی ہے، جس نے اپنے آپ کو ان چھوٹی چھوٹی مشتملات پر منقسم کر دیا ہے۔ بقول مرزا غالب:

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ دہر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

یہ قطرہ و موج و حباب حقیقت میں وحدتِ بحر سے اُبھرے ہیں۔ غرض زندگی کی ساری کشمکش اور ساری تگ و دو، اور اس کی گہما گہمی اور ہنگامے اسی حقیقی وحدت کے حصول کے لیے ہیں اور اس کے لیے مسلسل جستجو اور جدوجہد کرنا ہی زندگی ہے۔ اسی سے زندگی میں توانائی آتی ہے لیکن اقبال کے نزدیک عقل، عشق سے اور بلند مقاصد سے عقلِ سلیم بنتی ہے اور پھر اپنے کاروبار میں کامیاب ہوتی ہے۔ اگر عقل کا رشتہ عشق سے کٹ جائے تو اس کی فعالیت کم ہو جاتی ہے اور وہ بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں افسردہ پڑ جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ ترین درجے کی عقل مردانِ کار میں پائی جاتی ہے، جن کے دل عشق کے جہاں پرور جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ مردانِ کار جو انبیا اور اولیا کی طرح زندگی میں کسی بڑے مقصد کے لیے آتے ہیں اور اسی منزلِ مقصود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ عقل کو عشق سے پیوستہ کرنا اور اسے کارآمد بنانا اور اس کی فعالی قوتوں کو صحیح راہ پر لگانا عشق کا کام ہے۔ جذبے کا کام ہے۔ اسی عشق کو اقبال نے اس قطعے میں ''جنوں'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اقبال اس قطعے میں عقل کو ذُوفنُوں کہتا ہے کیونکہ وہ طرح طرح کے فنون اور فسون اور حیلہ سازیوں

سے آشنا ہے۔

صاحبِ نظر انسان کا کام یہ ہے کہ وہ عقل کی ان حیلہ سازیوں سے بچے اور اسے جذبہ جنوں سے صحیح راہ پر لے آئے تا کہ وہ کارآمد ثابت ہو سکے۔ درحقیقت عقل جب اپنی صحیح راہ پر آتی ہے اور اس میں مقصدیت اور بلندی پیدا ہوتی ہے تو وہ عشق کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔ شاعر جب یہ کہتا ہے کہ اقبال نے آخر کار عقلِ ذوفنوں سے رہائی پائی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ رہائی پانے کا کوئی مخصوص وقت تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں عشق یا جنوں کا مقام ہی مناسب اور صحیح مقام ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ خان، عبیداللہ، ۱۹۹۵ء، ''کچھ صد اشعار فارسی کے بارے میں''، صد شعرِ اقبال: فارسی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۳

۲۔ ایضاً: ص ۵

۳۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق؛ قطعہ ۱۱۵)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۲۳۰۔

۴۔ حافظ کا مصرع ثانی یوں ہے:

بہ از اں کہ چترِ شاہی ہمہ روز و ہائی و ہوئی

رک: دیوانِ حافظ، اسلام آباد، مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۲۔

۵۔ مصرعِ اوّل کی درست صورت یہ ہے:

وادیٔ عشق بسی دور و دراز ست ولی

رک: اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (زبورِ عجم؛ بہ خوانندۂ کتاب زبور)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۳۵۲۔

۶۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (رموزِ بےخودی؛ حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنی مساواتِ اسلامیہ)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۱۱۹

۷۔ پوری آیۂ کریمہ یہ ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ O

القرآن: پارہ ۲، آیت: ۱۷۹

۸۔ پوری آیۂ کریمہ یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ج

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ O

القرآن: پارہ ۱۴، آیت ۹۰

۹۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (ارمغانِ حجاز؛ حضورِ حق)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۷۷۲۔

۱۰۔ درست مصرع یوں ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں

رک: اقبال، محمد، ۲۰۰۴ء، کلیاتِ اقبال اُردو (بالِ جبریل؛ حصّہ اوّل)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۳۵۵۔

۱۱۰۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (ارمغانِ حجاز؛ بہ یارانِ طریق)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۸۶۴۔

۱۲۔ ایضاً: ص ۷۸۶

۱۳۔ ۱۹۹۴ ______ ء، کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق؛ لالۂ طور)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۲۱۲۔

۱۴۔ غالب کا شعر یوں ہے:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

رک: غالب، مرزا، دیوانِ غالب، لاہور، مکتبہ جدید؛ ص ۱۸۰

۱۵۔ ۱۹۹۴ ______ ء، کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق؛ لالۂ طور)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۲۱۳

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ کلیاتِ غالب (فارسی) کے مطابق مصرعِ ثانی یوں ہے: باہمہ در گفتگو، بے ہمہ با ماجرا؛ رک: غالب، مرزا، کلیاتِ غالب (فارسی)، لاہور، ص ۱۸۰۔

۱۸۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق؛ لالۂ طور)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۲۱۶

۱۹۔ ایضاً: ص ۲۳۳

۲۰۔ ایضاً: ص ۲۳۹

Abstract

Sufi Ghulam Mustafa Tabassum is one of the most respected creative writers of twentieth century. He brought the wealth of his creative, academic and literary faculties into various academic and literary fields. He was very impressed by the thought and poetry of Allama Muhammad Iqbal. In order to introduce youth to Iqbal's thought, he began a series called "A Verse by Iqbal" for the Radio Pakistan. In this radio program he would give easy-to-understand interpretation of Iqbal's difficult Urdu and Persian verses. From this series, one hundred of the Persian verses and one hundred of the Urdu verses have been published as a book. In this article, I present some more Persian verses which are yet unpublished. This will contribute towards a better understanding of Iqbal's poetry and would help students of the Iqbal Studies in understanding Iqbal's thought.

Keywords: Sufi Ghulam Mustafa Tabassum, Allama Iqbal, Poetry, Persian, Radio pakistan.